فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں | شاہد رضا | ۴

قرآنیات

سورۃ یونس (۵) | جاوید احمد غامدی | ۵

معارف نبوی

جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات | امین احسن اصلاحی | ۱۷

مقالات

مقدمہ تفسیر نظام القرآن | امام حمید الدین فراہی | ۲۳

سیر و سوانح

حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ | محمد وسیم اختر مفتی | ۳۱

نقد و نظر

نشوز اور اس کا علاج | رضوان اللہ | ۳۹

ادبیات

فضول خرچی کا انجام | مولانا الطاف حسین حالی | ۴۹

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

شاہد رضا

''قرآنیات'' میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ قسط سورۂ یونس (۱۰) کی آیات ۳۷-۷۰ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ قرآن کتاب الٰہی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی سے نوازا ہے۔

''معارف نبوی'' میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات'' شامل کیا گیا ہے۔ یہ ''موطا امام مالک'' کی چند روایات پر مشتمل ہے۔ ان کا موقف ہے کہ لفظ 'کذب' کے مفہوم میں ذو معنی بات یا مغالطہ آمیز بات کرنا بھی شامل ہے اور ایسی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں جو جواز کے اندر ہوں اور ان کی مدد سے آدمی کی گھریلو زندگی خوش گوار رہے۔

''مقالات'' میں مولانا حمید الدین فراہی کا مضمون ''مقدمہ تفسیر نظام القرآن'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے تفسیر کے بنیادی اصول نظم قرآن کے بارے میں کہا ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جز ہوا کرتا ہے، اگر اس کو چھوڑ دیں تو خود کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔

''سیر و سوانح'' میں جناب محمد وسیم اختر مفتی صاحب کا مضمون ''حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ'' شائع کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان کی سبقت اسلام، ہجرت مدینہ، سریۂ عبیدہ بن حارث اور غزوۂ بدر میں کردار کو بیان کیا ہے۔

''نقد و نظر'' میں جناب رضوان اللہ صاحب کا مضمون ''نشوز اور اس کا علاج'' شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان تدابیر کے بارے میں اپنی آرا پیش کی ہیں جنھیں بیوی کے نشوز کی اصلاح کے لیے خاوند کو اختیار کرنی چاہییں۔

''ادبیات'' میں مولانا الطاف حسین حالی کی نظم ''فضول خرچی کا انجام'' شامل کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے ایک دولت مند اور فقیر کا واقعہ منظوم بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دولت ایک زوال پذیر شے ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سورة یونس

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ

یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو خدا کے بغیر تصنیف کر لیا جائے[۵۸]، بلکہ اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اِس سے پہلے موجود ہیں[۵۹] اور قانون الٰہی کی تفصیل ہے[۶۰]۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پروردگار عالم کی

۵۸؎ اِس لیے کہ اِس کا مافوق انداز کلام خود بتا رہا ہے کہ کوئی انسان اِس شان کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا۔

۵۹؎ اشارہ ہے آخری نبوت کے لیے تورات و انجیل کی اُن پیشین گوئیوں کی طرف جو اپنے محمل و مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے وہ سب سچی ثابت ہوئیں اور نتیجے کے طور پر قرآن کے بارے میں بھی ثابت ہو گیا کہ وہ فی الواقع اُس خدا کا کلام ہے جس نے صدیوں پہلے سے بتا رکھا تھا کہ وہ اِس شان کی ایک کتاب نازل کرے گا۔

۶۰؎ اصل میں لفظ 'الْكِتٰب' آیا ہے۔ اِس کے ایک معنی قانون و شریعت کے بھی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ اِسی معنی میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ابراہیمی دین کے جن احکام سے تم واقف ہو، یہ اُسی کی تفصیل ہے اور یہ اِس بات کا مزید ثبوت ہے کہ قرآن اُسی خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس کی طرف سے ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کے صحیفے نازل کیے گئے تھے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾
بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

طرف سے ہے۔کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اِسے گھڑ لیا ہے؟ (اِن سے) کہو، اگر تم سچے ہو تو اِس جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو، بلا لو۔[۶۱] (نہیں، یہ بات نہیں ہے)، بلکہ یہ اُس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو اِن کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کی حقیقت ابھی اِن پر ظاہر نہیں ہوئی۔[۶۲] اِن سے پہلے کے لوگوں نے بھی اِسی طرح جھٹلایا تھا۔ پھر دیکھ لو کہ اُن ظالموں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۷-۳۹

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)۔ اِن میں وہ بھی ہیں جو اِس قرآن کو مانیں گے اور وہ بھی جو نہیں مانیں گے، (اِس لیے کہ آمادۂ فساد ہیں) اور تیرا پروردگار اِن مفسدوں سے خوب واقف ہے۔[۶۳]

---

۶۱ مطلب یہ ہے کہ تم اگر اِسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت، مضامین اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اُس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔

۶۲ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ قرآن کی صداقت کے دلائل اِن پر واضح نہیں ہو سکے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کے جو نتائج بیان کر رہا ہے، وہ اِن کے علم کی گرفت میں نہیں آ رہے اور اُن کی حقیقت ابھی اِن پر ظاہر نہیں ہوئی، لہٰذا بے خوف ہیں اور بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ جس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کا کوئی نمونہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے۔ اِن کے انکار کی وجہ اِن کی یہ بے خوفی ہے۔ اِسی نے اِنھیں غیر سنجیدہ بنا دیا ہے اور یہ اِس طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ علم و استدلال کی بنیاد پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا
لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا
يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ

یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم پر میرے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور مجھ پر تمھارے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے[۶۴]۔ (تم اُن کے درپے کیوں ہوتے ہو جو اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں)؟ اِن میں وہ بھی تو ہیں جو تمھیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر کیا بہروں کو سناؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ اور اِن میں وہ بھی تو ہیں جو پوری توجہ سے تمھیں دیکھتے ہیں۔ پھر کیا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں[۶۵]۔ ۴۱-۴۴

(اِس وقت یہ مست ہیں، لیکن) جس دن اللہ اِنھیں اکٹھا کرے گا، (اُس دن محسوس کریں گے کہ) گویا دن کی ایک گھڑی کے لیے دنیا میں تھے۔ یہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، (گویا

۶۳؎ اِس میں پیغمبر کے لیے تسلی کے ساتھ مکذبین قرآن کے لیے دھمکی بھی ہے کہ تیرا پروردگار خوب واقف ہے تو ایک دن اِن کی شرارتوں کا مزہ بھی اِنھیں چکھا دے گا۔

۶۴؎ یہ پیغمبر کے لیے اظہار براءت کا حکم ہے جس کے بعد صرف عذاب ہی کا انتظار ہوتا ہے۔

۶۵؎ یعنی یہ جو دیکھتے ہو کہ لوگوں میں سے زیادہ ایسے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں کہ بالآخر عذاب کے مستحق ٹھیرتے ہیں تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ نے اِن پر کوئی ظلم کیا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ اِن کی خواہشیں اور اِن کے تعصّبات ہیں جنھوں نے اِنھیں اِس طرح اندھا بہرا کر دیا ہے کہ حق کی ہر صدا اور اُس کا ہر داعی اِن کے لیے اجنبی ہو گیا ہے۔ اِن کے اِس رویے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا اور یہی نکلا ہے کہ اب یہ عذاب کی زد میں ہیں۔

خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ
الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

ابھی مل کر آئے ہیں)۔(اُس دن واضح ہو جائے گا کہ) سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلا دیا اور راہ راست پر نہیں آئے۔ ہم جس چیز کا وعدہ اُن سے کر رہے ہیں، اُس کا کوئی حصہ ہم تمھیں دکھا دیں گے، (اے پیغمبر) یا تم کو وفات دیں گے (اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں گے)۔ سو ہر حال میں اِن کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ اُس پر گواہ ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ (اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔[۶۶]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۶۶؎ یہ اُسی قانون کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ نبوت و رسالت کو ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دینے سے پہلے دنیا کی تمام قوموں پر خود اُنھی کے رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔ قرآن میں اِس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اِس دعوت کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اُس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد یہ فیصلہ اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اِس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا
وَّلَانَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّا ذَا يَسْتَعْجِلُ
مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَاوَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

(اِس کے جواب میں) یہ کہتے ہیں کہ تم سچے ہو تو (ہمارے لیے) یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ (اِن سے) کہو، (میں اِس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں)، میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ (اُس کے ہاں) ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب اُن کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے ہیں، نہ آگے۔ (اِن سے) کہو، یہ بتاؤ کہ اگر اُس کا عذاب تم پر رات یا دن میں کسی وقت آپڑے تو کیا چیز ہے جس کے بھروسے پر یہ مجرم جلدی مچائے ہوئے ہیں؟[۶۷] پھر کیا جب آپڑے گا، اُسی وقت اُس کو مانو گے؟ اب مانتے ہو، تم اِسی کے لیے جلدی

میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح، قوم شعیب اور اِس طرح کی بعض دوسری قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اِس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے اُن کو چھوڑنے کے بعد اُن کی ہلاکت کے بجاے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب اُن پر مسلط کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں قوم کو کچھ مزید مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اِس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے۔ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد اُنھیں اِس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظم بھی کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اِس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

۶۷؎ یہاں اسلوب تبدیل کر کے اُن کے لیے مجرم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہاں مجرموں کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف بھی ہے کہ جو لوگ جرم سے بری ہیں، اگر وہ

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ
اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا
الْعَذَابَ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾
هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

مچائے ہوئے تھے۔ اُس وقت اِن ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ اُسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔ ۴۵-۵۲

وہ تم سے پوچھتے ہیں: کیا یہ واقعی سچ ہے؟[۶۸] کہہ دو، ہاں، میرے پروردگار کی قسم، یہ شدنی ہے اور تم خدا کو ہرا نہیں سکو گے۔[۶۹] (اُس وقت) ہر شخص کے پاس جس نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو (اپنے آپ کو بچانے کے لیے) وہ اُس کو فدیے میں دینا چاہے گا۔ (اُس وقت) یہ دل ہی دل میں پچھتائیں گے، جب عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے اور اِن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اِن پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ سنو، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ سن رکھو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے، مگر (افسوس کہ) اِن میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور تم اُسی

اِس طرح کا سوال کرتے تو اِس کے لیے تو ایک جواز ہو سکتا تھا، لیکن جو لوگ مجرم ہیں اور جن کے جرم ہی کی پاداش میں یہ برق خاطف گرنے والی ہے، اُن کی یہ ڈھٹائی اُن کی بدبختی اور شامت کے سوا اور کس چیز کی دلیل ہے!''

(تدبر قرآن ۴/۶۱)

۶۸۔ اِس سوال میں انکار و استہزا کا وہ پہلو نمایاں ہو گیا ہے جو او پر 'مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ' کے سوال میں ذرا مخفی تھا۔

۶۹۔ یہ اُن کی رعونت پر ضرب لگائی ہے کہ اِس وقت تو مذاق اڑا رہے ہو، لیکن جب حقیقت سامنے آ جائے گی تو خدا کے مقابلے میں بے بسی کے سوا تمھارے پاس کچھ بھی نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا
هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾
قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ

کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۰] ۵۳-۵۶

لوگو، تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نصیحت آگئی ہے اور جو سینوں میں (دھڑکتے) ہیں[۱]، اُن کی شفا اور اُن کے لیے ہدایت و رحمت[۲] جو ماننے والے ہوں۔ (اِنھیں) بتاؤ (اے پیغمبر)، یہ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت سے آئی ہے[۳]۔ سو چاہیے کہ اِس پر وہ خوشی منائیں۔ یہ اُس سے بہتر ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں[۴]۔ ۵۷-۵۸

(اِن سے) پوچھو، ذرا بتاؤ تو سہی کہ اللہ نے تمھارے لیے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اُس

۰ے مطلب یہ کہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی وہاں تمھارا استقبال کرنے کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ تنہا خدا ہوگا جس کے حضور میں پیش کر دیے جاؤ گے۔

اے یہ اُن بیماریوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کو لگ جاتی ہیں اور انسان کو تمام انسانی اوصاف سے محروم کر کے حیوانات کے درجے تک گرا دیتی ہیں۔

۲ے یعنی دنیا میں ہدایت اور آخرت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس کے ماننے والوں کو لازماً حاصل ہو جائے گی۔

۳ے اِس جملے میں فعل محذوف ہے، یعنی 'قل بفضل اللّٰه و برحمته جاء'۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۴ے اِس سلسلۂ کلام کی ابتدا آیت ۳۷ میں منکرین کے اِس خیال کی تردید سے ہوئی تھی کہ قرآن کو یہ پیغمبر خود گھڑ کر لے آئے ہیں۔ اُن سب چیزوں پر استدلال کے بعد جو اِس معاملے میں الجھن کا باعث بن رہی تھیں، یہ اب بطور التفات قرآن کی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اٰذِنَ لَکُمۡ اَمۡ عَلَی اللّٰہِ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۹﴾ وَ مَا ظَنُّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۰﴾
وَمَاتَکُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡہُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا
عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا اِذۡ تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ وَمَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ

میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھیرا لیا۔ پوچھو، اِس کا حکم تمھیں اللہ نے دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟ اُن لوگوں کا کیا گمان ہے قیامت کے دن جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں[۵]؟ (یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اُس نے اِنھیں مہلت دے رکھی ہے، ورنہ اِس جسارت پر اِن کا قصہ ابھی پاک ہو جاتا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اُن میں سے اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔ ۵۹-۶۰

(تم اِن کی پروا نہ کرو اور اپنا کام کیے جاؤ، اے پیغمبر)۔ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور (ہم نے جو کچھ نازل کیا ہے)، اُس میں سے قرآن کا جو حصہ بھی پڑھ کر سناتے ہو[۶] اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو[۷]، ہم تمھارے پاس موجود ہوتے ہیں، جس وقت تم اُس میں مشغول ہوتے ہو[۸]۔ (حقیقت

۵؎ یہ افترا علی اللہ کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...سوال کر کے جواب دیے بغیر بات ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ شامت زدہ لوگ اِس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں۔ قیامت آئے گی تو اِنھیں پتا چلے گا کہ اِس جسارت کی اِن کو کیا سزا ملتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۶۴)

۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'مَا تَتۡلُوۡا مِنۡہُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ'۔ اِن میں ضمیر مجرور کا مرجع وہی کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۵۷-۵۸ میں گزر چکا ہے اور قرآن سے مراد اُس کا کوئی جزو یا حصہ ہے۔

۷؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ آپ کے جاں نثار ساتھیوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے تسلی و بشارت کے اِس پیغام میں شامل کر لیا ہے۔

۸؎ پیچھے کی بات پر اِس قید سے کیا پیش نظر ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾ اَلَآ اِنَّ
اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

یہ ہے کہ) تیرے پروردگار سے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں اور نہ ذرّے سے چھوٹی، نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ (لوگو) سنو، (خدا کا پیغمبر اور اُس کے ساتھی، سب اللہ کے دوست ہیں اور) اللہ کے دوستوں کے لیے، جو ایمان لائے اور خدا سے ڈرتے رہے، (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے[۷۹] اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یہ (خدا کی بات ہے اور) خدا کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی[۸۰]۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ تمھیں رنجیدہ نہ کرے[۸۱]، (اے پیغمبر)۔ تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے، (تم اُس پر بھروسا رکھو اور اپنا کام کیے جاؤ)، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ ۶۱ - ۶۵

’’... اِس قید سے ایک تو اُس غیرمعمولی انہماک پر بھی روشنی پڑی جو اقامت دین کی اِس جدوجہد میں صحابہ کو تھا۔ دوسرے اِس سے تسلی کے مضمون کی بلاغت بھی دوچند ہوگئی ہے، اِس لیے اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اپنے تن، من، دھن ہر چیز سے بے پروا ہو کر خدا کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہوتے ہو تو اُس وقت ہم تمھارے پیچھے تمھاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۶۵)

۷۹؎ اِس لیے کہ رسولوں کے باب میں خدا کی سنت یہی ہے کہ اُنھیں اور اُن کے ساتھیوں کو دنیا میں بھی لازماً غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

۸۰؎ باتوں سے یہاں خدا کے وعدے مراد ہیں جنھیں دوسرے مقامات میں سنن الٰہیہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

۸۱؎ اشارہ ہے منکرین کی اُن باتوں کی طرف جو وہ طنز و استہزا کے طور پر کہتے تھے کہ یہ اگر خدا کے پیغمبر ہیں تو اِن پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا اِن کے منصب کی منادی کے لیے اِن کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ استاذ امام

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

سن رکھو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب اللہ ہی کے ہیں اور جو اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ شریکوں کی پیروی نہیں کرتے۔[۸۲] حقیقت یہ ہے کہ وہ محض گمان کی پیروی کرتے اور نرے اٹکل دوڑاتے ہیں۔ (سنو)، وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو (پرسکون) بنایا تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنا دیا (تاکہ معاش کی جدوجہد کرو)۔[۸۳] اِس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔[۸۴] انھوں نے کہا ہے کہ خدا کی اولاد ہے۔ وہ اِس سے پاک ہے (کہ کسی کو بیٹا یا بیٹی بنائے)۔ وہ (ایسی ہر چیز سے) بے نیاز ہے۔ زمین و آسمان میں جو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لکھتے ہیں:

''...اِن آیات کے نزول کے دور میں مسلمانوں کا جو حال تھا، اُس کے لحاظ سے تمکن اور غلبہ کی وہ بشارت جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی کفار کے لیے طنز و استہزا کا موضوع بن سکتی تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے اور اُنھوں نے کہا بھی ہوگا کہ ذرا اِس نئے دین کے سرپھروں کا حوصلہ دیکھو کہ کسی کو دو وقت کی قرینے کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو سلیقے کا لباس نصیب نہیں، لیکن حکومت و سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اِسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ تمھیں مخالفین کی اِس طرح کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمھارے لیے جو بشارت ہے، وہ حتمی اور قطعی ہے۔ عزت کا مالک اللہ ہے۔ یہ چیز جس کو بھی ملتی ہے، اللہ ہی کے دیے ملتی ہے۔ اب اللہ نے اگر یہ عزت تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو دینے کا فیصلہ فرما لیا ہے تو اُس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟'' (تدبرقرآن ۴/ ۶۶)

۸۲؎ اِس لیے کہ خدا کا تو کوئی شریک ہے ہی نہیں کہ اُس کی پیروی کی جائے۔

۸۳؎ اِس جملے میں عربیت کے اسلوب پر مقابل کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اِنھیں کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: 'جعل لكم الليل (مظلمًا) لتسكنوا فيه والنهار مبصرًا (لتعملوا فيه)'۔

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا
مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ تمھارے پاس اِس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم خدا پر ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اُن کے لیے یہی تھوڑا سا فائدہ ہے جو دنیا میں اُٹھائیں گے۔ پھر اُن کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔ پھر اُن کے اِس کفر کی پاداش میں ہم اُن کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۶۶-۷۰

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۸۴؎ یہ کیا نشانیاں ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’سب سے پہلے تو اُس توافق پر نگاہ کیجیے جو رات اور دن کے اندر باوجودیکہ وہ دونوں ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، پایا جاتا ہے کہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ رات اُس کے لیے راحت کا بستر بچھاتی ہے اور دن اُس کے لیے سرگرمیوں کا میدان کھولتا ہے۔ یہی حال اِس کائنات کے تمام اضداد کا ہے کہ وہ پوری وفاداری اور سازگاری کے ساتھ اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اُس سے ذرا انحراف اختیار نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایک بالاتر اور حکیم ارادہ اِس کائنات کے پورے نظام پر حاوی اور قاہر ہو اور وہ اِس کے اجزاے مختلفہ میں ربط و تعلق پیدا کر کے اِس کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہو —— یہ اُس توحید کی دلیل ہوئی جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے۔

دوسری چیز جو ظاہر ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات نہ کوئی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں آ جانے والی شے ہے اور نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے، بلکہ اِس کے ہر گوشے میں عظیم قدرت، حیرت انگیز حکمت اور نہایت گہری غایت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے، نہ یوں ہی تمام ہو جائے، بلکہ ضروری ہے کہ یہ کسی عظیم غایت پر منتہی ہو اور یہ غایت بغیر اِس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ اِس کے بعد آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

تیسری چیز وہ ربوبیت کا نظام ہے جو اِس کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ ربوبیت مسئولیت کو مقتضی ہے۔ جس نے ہمارے لیے زندگی اور پرورش کا یہ سارا نظام قائم کیا ہے، اُس کا ہم پر فطری طور پر حق قائم ہوتا ہے اور لازم ہے

کہ ایک دن اُس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔جنھوں نے اِس حق کو پہچانا ہو، وہ اُس کا انعام پائیں اور جنھوں نے اِس کی ناقدری کی ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔ اِس اعتبار سے یہ جزا وسزا کی دلیل ہوئی۔‘‘(تدبرقرآن ۴/۶۸)

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی
ترتیب وتدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات

(مَا جَاءَ فِی الصِّدْقِ وَالْکَذِبِ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَیْمٍ أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَکْذِبُ إِمْرَأَتِی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا خَیْرَ فِی الْکَذِبِ، فَقَالَ الرَّجُلُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَعِدُهَا وَأَقُوْلُ لَهَا؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا جُنَاحَ عَلَیْكَ.

صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں اپنی بیوی سے کوئی بات جھوٹ کہہ سکتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، جھوٹ میں کوئی خیر نہیں، اس نے کہا: یارسول اللہ، میں اس سے کوئی وعدہ کرلوں، کوئی بات تسلی کی کرلوں تو کیا یہ جائز ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔

وضاحت

خانگی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے آدمی کو کئی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ ہر عاقل آدمی مصالحت کی پالیسی اختیار

کرتا ہے۔ بسا اوقات اس میں بات بنانی پڑتی ہے یا مغالطہ آمیز بات کرنی پڑتی ہے۔ آدمی نے جب یہ سوال کیا کہ کیا میں بیوی سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟ تو آپ نے اس کی صاف صاف ممانعت فرما دی کہ جھوٹ بولنے میں کوئی خیر نہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ میں اس سے کوئی وعدہ یا تسلی کی بات کر سکتا ہوں تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھنے والے کے سوال کا یہ مطلب لیا کہ اس کی پہلی بات ماضی سے متعلق ہے اور دوسری مستقبل سے متعلق۔ تو ماضی کے کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جھوٹ نہیں بولا جائے گا، لیکن مستقبل چونکہ پردہ میں ہوتا ہے، اس توقع پر کہ فلاں کام ہو جائے گا، آدمی اس کے بارے میں وعدہ کر سکتا ہے۔ اس میں وعدہ پورا ہونے یا پورا نہ ہونے، دونوں کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ پھر مستقبل کے کسی وعدہ میں یہ شرط مضمر ہوتی ہے کہ اگر حالات نے ساتھ دیا تو یوں کروں گا، اگرچہ یہ شرط الفاظ میں ادا نہ ہوتی ہو۔

اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ بیوی کو جھوٹے چکمے دے کر خوش رکھنا مطلوب ہے۔ البتہ ایسی شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں جو جواز کے اندر ہوں اور ان کی مدد سے آدمی کی گھریلو زندگی خوش گوار رہے۔

روایت میں 'کذب' کا جو لفظ آیا ہے، یہ عربی میں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفہوم میں ذو معنی بات یا مغالطہ آمیز بات کرنا بھی شامل ہے، اور جو لوگ بیوی بچے والے ہیں، ان کو گھریلو ماحول سازگار رکھنے کے لیے ایسی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَالْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَ إِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَالْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ أَلَا تَرٰى أَنَّهُ يُقَالُ: صَدَقَ وَ بَرَّ وَ كَذَبَ وَ فَجَرَ.

عبداللہ بن مسعود فرماتے تھے کہ سچائی کو اختیار کرو، کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مثل بیان کی جاتی ہے: ''اس نے سچ کہا اور وفاداری کی، اس نے جھوٹ کہا اور نافرمانی کی''۔

وضاحت

اس روایت کو بخاری نے بھی لیا ہے۔ وہاں یہ موصول کی شکل میں ہے اور یہاں مرسل ہے۔ سند کے لحاظ سے روایت کا جو درجہ بھی ہو، فلسفۂ دین کے لحاظ سے اس کا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔

حضرت ابن مسعود کا کہنا یہ ہے کہ سچائی اختیار کرو، کیونکہ سچائی ہمیشہ تمھیں خیر، نیکی، بِرّ، وفاداری کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بر جنت کی طرف لے جائے گی۔ 'بر' کے صحیح معنی وفاداری کے ہیں۔ نیکی اس کا ناقص ترجمہ ہے۔ قرآن میں 'بَرًّاۢ بِوَالِدَیۡهِ'* اپنے والدین کے وفا شعار اور فرماں بردار بیٹے کے لیے آیا ہے۔ 'بَر' اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سارے وعدے پورے کرے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی۔ اگر آپ جھوٹ نہیں بولتے تو شیطان کا آپ پر کوئی زور نہیں چلے گا۔ اگر آپ عزم کر لیں کہ صداقت اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی کریں گے۔ اس وقت آپ کی زبان سے وہ باتیں نکلیں گی، جیسے لقمان حکیم کی زبان سے نکلتی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مزید غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نفاق کا پردہ جھوٹ کے سوا اور کوئی نہیں اور نفاق ایمان کی ضد ہے۔ نفاق کے ساتھ کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی تو ایمان کیسے باقی رہے گا۔ جھوٹ عملی بھی ہوتا ہے اور قولی بھی۔ عملی جھوٹ تو یہ ہے کہ آپ نماز پڑھیں تو مجبورانہ یا ریاکاری کے لیے پڑھیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ 'اِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی'**، کسل اور بے دلی کے ساتھ نماز ادا کرنا عملی جھوٹ ہے۔ قولی جھوٹ یہ ہے کہ آپ کہیں کچھ، لیکن آپ کے دل میں اس کا الٹ ہو۔ منافق کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا ہے جس پر وہ اعتماد کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ قولی اور عملی جھوٹ بول دے گا۔ آپ کو بے وقوف بنا دے گا۔ وعدے کی خلاف ورزی کرے گا، لیکن اس کی بات کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ سچا آدمی کسی کو اس طریقے کا دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا، کیونکہ اس نے تو سچی بات کہنی ہے۔ وہ اگر کر سکتا ہے تو مغالطہ آمیز بات کر سکتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بعض نازک مواقع پر ذو معنی بات کر کے اپنی قوم کو غچا دے دیا۔ لیکن اس کے لیے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کی نہایت عمدہ مثال ہمارے سب سے بڑے آدمی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ملتی ہے۔ میں جب اس کو یاد کرتا ہوں تو عش عش کر اٹھتا ہوں۔ مدینہ منورہ کو ہجرت کے سفر میں آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق تھے۔ کفار مکہ نے

---

* مریم ۱۹: ۱۴۔

** النساء ۴: ۱۴۲۔

حضور کی گرفتاری کے لیے آدمی پھیلا رکھے تھے۔اسی دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جاننے والا ایک شخص سر پرآ پہنچا۔اس نے انھیں مخاطب کرکے پوچھا: 'من معك هذا' (یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟) غور کیجیے کہ ناگہانی طور پر اس سوال کا فوری جواب دینا کتنا مشکل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت ہو جانے میں کتنے خطرات درپیش ہو سکتے تھے، لیکن نہایت سادگی سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا 'رجل یھدینی الطریق' (ایک شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے)۔ یہ کتنی سچی بات تھی۔صحرائی سفر میں راستہ دکھائے بغیر آدمی سفر کر ہی نہیں سکتا۔اس حوالہ سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ممکن ہے آدمی کرائے پر لیا ہوتا کہ راستہ دکھائے۔دوسری طرف پیغمبر سے بڑھ کر صحیح راستہ دکھانے والا کون ہوسکتا ہے؟ پوچھنے والے کا ذہن پہلی بات کی طرف چلا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی ممکن خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔اس طرح کی گفتگو بجاے خود سچ پر مبنی ہوتی ہے، لیکن کہنے کے انداز سے دوسرا آدمی غچا کھا جاتا ہے۔

حَدَّثَنِی مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ قِيلَ لِلُقْمَانَ: مَا بَلَغَ بِكَ مَا نَرٰى؟ يُرِيْدُوْنَ الْفَضْلَ، فَقَالَ لُقْمَانُ: صِدْقُ الْحَدِيْثِ وَأَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِيْنِی.

امام مالک کی بلاغات میں سے ہے کہ لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ کو جو بلند درجہ ملا ہے آپ اس پر کس طرح سے پہنچے ہیں، تو لقمان نے کہا کہ بات کی صداقت سے، امانت کی ادائیگی سے اور اپنے سے غیر متعلق باتوں سے اجتناب کی بنا پر۔

وضاحت

یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔حضرت لقمان نبی نہیں تھے، بلکہ عرب کے حکما میں سے تھے۔قرآن مجید میں ان کا ذکر اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے کے ضمن میں ہوا ہے۔اس میں یہ باتیں نہیں ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض واقعات اور اقوال عرب میں مشہور بھی تھے اور لوگ ان کو بیان کرتے تھے۔انھی میں سے ایک واقعہ امام مالک نے لیا ہے۔

حضرت لقمان حکمت کے جس بلند مقام تک پہنچے، اس کو وہ تین صفات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔سچائی، امانت اور غیر متعلق باتوں سے سروکار نہ رکھنا۔یہ تینوں نہایت بلند اخلاقی صفات ہیں۔سچائی اور امانت کا وصف تو قرآن مجید کی رو سے ہر پیغمبر کا لازمی وصف ہوتا ہے۔اسی طرح جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد زندگی ہو، اس کے پاس غیر متعلق

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

باتوں میں دل چسپی لینے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

یہ روایت بھی کسی پہلو سے حدیث کی تعریف میں نہیں آتی۔ امام مالک کے ہاں اس طرح کی بلاغات کی کثرت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ابتدائی دور میں کسی بھی اچھی بات کو روایات میں جگہ دے دی جاتی تھی۔ خواہ وہ کسی سابق پیغمبر سے منسوب ہو یا اس کی نسبت کسی حکیم شخص یا صحابی کی طرف کی جاتی ہو۔ چونکہ اس طرح کی حکیمانہ باتیں عوام کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں، اس لیے امام مالک نے ان کو بلاغات کے طور پر لے لیا، یعنی ان کے لیے سند کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سند کا جو پہاڑ بنا لیا گیا، یہ بعد کی بات ہے۔

حَدَّثَنِی مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ: لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَ تُنْكَتُ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ حَتّٰى يَسْوَدَّ قَلْبُهُ كُلُّهُ فَيُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْكَاذِبِينَ.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام مالک کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے تو ایک ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جھوٹوں میں لکھا جاتا ہے۔

وضاحت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول صحیح اور اصول کے مطابق ہے۔ گناہ کرنے کے متعلق جو روایت آئی ہے، اس میں یہ ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے جو توبہ و استغفار سے صاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آدمی پروا نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تو پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی دلوں پر مہر ہو جانے کی حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل اس طرح بند ہو جاتا ہے کہ نیکی کی کوئی کرن اس سے گزر نہیں کر پاتی۔ چونکہ جھوٹ تمام گناہوں کی بنیاد ہے، اس لیے گناہ کے بارے میں سنۃ اللہ کا اطلاق اس پر ہوگا۔ لہٰذا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول بالکل ٹھیک ہے۔ اگرچہ روایت کی حقیقت بلاغات کی ہے اور یہ موقوف بھی ہے۔

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ أَنَّهُ قَالَ: قِيلَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِيلًا؟ فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا؟ فَقَالَ: لَا.

حضرت صفوان بن سلیم کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا، نہیں۔

وضاحت

سند کے لحاظ سے یہ روایت مرسل ہے اور اس لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ بہت اعلیٰ درجے کا ایمان ہوگا تو آدمی بزدل ہوگا، نہ بخیل۔ لیکن یہ کمزوریاں رکھتے ہوئے بھی مومن مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے کذاب ہونے کی نفی کردی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ منافق کا شیوہ ہوتا ہے اور منافق مومن نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہت ہی گھٹیا قسم کا کافر ہوتا ہے۔ اخلاقی جرأت کے فقدان کے باعث وہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جہنم کے سب سے بدترین درجے میں ہوگا۔ پھر اس امت کے افراد کی منصبی ذمہ داری حق کی سچائی کی گواہی دینا ہے، اس لیے کوئی صاحب ایمان اس وصف سے خالی نہیں ہوسکتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امام حمید الدین فراہی

مقدمہ

تفسیر نظام القرآن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے میں نے اپنی ''تفسیر نظام القرآن'' میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایک ایسی سادہ وصاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ہر آیت کا مفہوم اس کی مشابہ دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیا ہے اور ہر سورت کے نظام کو اس کی تہ میں اتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس جدوجہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے، اس کو عقل ونقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔

نظم قرآن

میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظم کی تلاش میں، میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے، تاہم یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں، میں تنہا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی علما کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں اور اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی ''اتقان'' میں لکھتے ہیں:

''ابوحیّان کے شیخ علامہ ابوجعفر بن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کا نام ''البرہان فی

مناسبۃ ترتیب سور القرآن'' ہے۔ ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب ''نظم الدُرر فی تناسب الآي والسور'' میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔'' (۲/۲۸۸)

اس کے بعد علامہ سیوطی نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے مختلف پہلو بھی انھوں نے بیان کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ ''نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علما نے اس سے بہت کم بحث کی ہے۔ امام فخر الدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے۔

خود مجھے امام رازی کی ''تفسیر کبیر'' میں، آیت 'وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا اَعْجَمِيًّا الاية' (حٰم السجدہ ۴۱: ۴۴) کے تحت نظم قرآن سے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان ملا:

''اس آیت کی شان نزول کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ کفار نے ازراہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اتری۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہم دگر کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن مجید پر ایک بہت بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظّم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے (اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کر کے فرماتے ہیں) ہر شخص جس میں انصاف ہوگا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی یہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایسے منظّم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر رکھا گیا ہو اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہوگی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔'' (۹/۵۶۹)

اس کے بالمقابل ایک دوسری جماعت بھی ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کسی قسم کا نظم نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ عز الدین بن عبد السلام کہتے ہیں:

''قرآن مجید، بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں، مختلف حالات کے لیے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا، جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو، اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا۔'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/۲۸۹)

یہ علما کے دو مختلف مذہب ہیں اور ان دونوں مذہبوں کے حامی و مؤیّد ہمارے ہاں موجود ہیں۔ میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اسی کا پیرو ہوں۔

اس تفصیل سے دو باتیں واضح کرنی چاہتا ہوں: ایک یہ کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بارہ میں علمانے یک قلم سکوت اختیار کیا ہو، بلکہ ایک گروہ نے اس کی طرف نہایت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ ایک تنگ راہ ہے جس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور یہ ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ اب تک دریافت ہو سکا ہے۔

مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے، سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ قصص میں کھولا، اور اس کی طرف میری رہنمائی باہر سے نہیں، بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دل دادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ میری سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی رہی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس وجہ سے نظم کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے، لیکن دو سورتوں میں مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی مجھے تحریک ہوئی۔ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی تعلیمی مشغولیتوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کسی کام کے لیے بہت کم وقت بچا سکتا تھا۔ اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ کی مدت بیت گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دست گیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے، اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کیا۔ سال بھر کی مدت میں اس کام کو میں نے تمام کیا۔ اس کے بعد یہ خیال ہوا کہ اپنے فکر و تدبر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کر دوں، لیکن ایک عظیم ذمہ داری اور اس کے دوررس نتائج کے ہیبت ناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔ چنانچہ ایک طویل مدت تک میں قرآن مجید پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا مانگتا رہا کہ وہ مجھے نفس کی شرارتوں اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔ ہر چند کہ حقیقت ایک عرصہ سے میرے سامنے بالکل واضح تھی، لیکن میری دلی خواہش یہی رہی کہ میں اس کے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بچا لے جاؤں، لیکن مندرجہ ذیل اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے اٹھانے سے گریز نہ کروں:

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لیے مجبور کیا ہے، یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیش تر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود، یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا، بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی، 'كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ'[1] (ایک بار آور درخت کے مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا

---

[1] ابراہیم ۱۴: ۲۴۔

میں پھیلی ہوئی ہوں) اور سارے مسلمان اللہ کی رسی کو متحد ہو کر تھام لیتے، جیسا کہ فرمایا ہے: 'وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا'[2] (اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ و اور منتشر نہ ہو)، لیکن جب صورت حالات اس کے بالکل برعکس ہو چکی ہے، اور لوگوں نے اس 'حَبۡلِ اللّٰهِ الۡمَتِيۡنَ' کو جس کی تعریف یہ ہے کہ 'لَا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ'[3] الآیہ'، ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس اختلاف سے نجات کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کر رہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے، اس کو گھسیٹے پھرتا ہے اور نظم کلام، جو صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہے اور جس سے اہل بدعت وضلالت اور اصحاب تحریف کی کج رویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، وہ بیچ سے بالکل غائب ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو اس کے لیے محرک ہوئی، وہ ملحدین کا اعتراض تھا۔ انھوں نے قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علماے اسلام ان کے جواب میں بجاے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے، اسی قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں یہ ملحدین کہہ رہے تھے۔ 'كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ'[4] اور 'وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا'[5]، ایسی حالت میں میرے لیے ممکن نہ رہا کہ میں حق کو سرنگوں اور باطل کو سربلند دیکھتا رہوں اور چپ چاپ بیٹھا رہوں، بالخصوص جبکہ میں پورے یقین کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ ملحدین کا اعتراض بالکل غلط ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۳۔ علاوہ ازیں یہ امر ہر شخص کو معلوم ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جز ہوا کرتا ہے، اگر اس کو چھوڑ دیجیے تو خود کلام کے مفہوم ومعنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو ایک چیز کے متفرق اجزا میں الگ الگ نہیں ہوا کرتی۔ انگور اور شراب ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص فہم نظام سے محروم رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود کلام کی ایک بڑی حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی اور عجب نہیں کہ وہ اہل کتاب کی اس صف سے جا ملے جس کا حال قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ:

فَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَاَغۡرَيۡنَا بَيۡنَهُمُ ''پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش

---

[2] آل عمران ۳: ۱۰۳۔

[3] حٰم السجدہ ۴۱: ۴۲۔ ''جس کے اندر باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے۔''

[4] الکہف ۱۸: ۵۔ ''کیا ہی بڑی بات ہے جو ان کے مونھوں سے نکل رہی ہے۔''

[5] النساء ۴: ۱۴۱۔ ''اور اللہ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر گرفت کا کوئی موقع نہیں دے گا۔''

اَلْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ. (المائدہ ۵:۱۴) — کر دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی۔''

مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ عداوت اور بغض، جس کی وبا آج مسلمانوں میں پھوٹ پڑی ہے، اسی بات کا نتیجہ ہو کہ ہم نے نظم قرآن کو نظر انداز کر کے خود قرآن کے ایک حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے، اس کی وجہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکی ہے، یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کے معانی کے بارہ میں ہماری رائیں مختلف ہو جائیں گی تو لازماً ہماری خواہشیں اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائیں گے اور ہمارا حال وہی ہو جائے گا جو اہل کتاب کا ہوا۔ صرف یہ فرق ہوگا کہ ان کے لیے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی تھا اور ہمارے لیے آخری چارۂ کار صرف یہی قرآن ہے۔

یہ نظم کلام ہی کا تقاضا ہے کہ انسانی فطرت کے ضعف کے سبب سے، جیسا کہ 'وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ الاية'[6] والی آیت میں بیان ہوا ہے، جو آیتیں بطور تخفیف کے نازل ہوئیں، ان کو اصل احکام کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کی تصدیق 'اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا الآية'[7] سے ہوتی ہے۔ یہ آیت اپنے اصل سابق حکم کے پہلو میں رکھی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ مزمل کی آخری آیت اس کی ابتدائی آیات کے بہت بعد نازل ہوئی ہے، لیکن رکھی وہیں گئی جہاں اس سلسلہ کے سابق احکام موجود تھے۔ یہی حال 'اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ'[8] والی آیت کا ہے۔ اسی طرح آیت 'وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا الآیه'[9] اس سلسلہ کے اصل احکام کے بعد بطور تتمہ نازل ہوئی اور غایت اہتمام کی وجہ سے، جیسا کہ آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم نے بالتفصیل بیان کیا ہے، پہلے تتمہ کے بعد رکھی گئی۔ اس طرح کی توضیحی و تشریحی آیات کے بعد بالعموم یہ آیت آیا کرتی ہے: 'كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ'[10] (اور اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اس وعدہ کا ایفا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے 'ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ'[11] (پھر

۶؎ طٰہٰ ۲۰: ۱۱۵۔ ''اور ہم نے آدم سے ایک بات کا اس سے پہلے عہد لیا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔''

۷؎ الانفال ۸: ۶۶۔ ''اب اللہ نے تمھاری ذمہ داری ہلکی کر دی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔''

۸؎ البقرہ ۲: ۱۸۷۔ ''تمھارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔''

۹؎ البقرہ ۲: ۲۳۴۔ ''اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں۔''

۱۰؎ البقرہ ۲: ۱۸۷۔

ہمارے اوپر اس کو (قرآن کو) واضح کرنا ہے) اور اس دعا کا جواب ہے جو سورۂ طٰہٰ میں مذکور ہے کہ 'رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا'[12] (میرے پروردگار، میرے علم کو زیادہ کر)۔

ہمارا یہ استنباط قرآن سے تھا۔ بعینہٖ اسی بات کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت اترتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے اور وہ اسی جگہ رکھی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جب تمام ہو جاتی تو حضرت جبریل امین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری سورہ از سر نو سنا دیتے۔ ہمارے نزدیک یہی وہ جمع کرنا اور پڑھنا ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ہوا ہے اور جس کی پیروی کا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جہاں تک قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس بارہ میں امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جس قدر فرقے ہیں، سب کے پاس قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

پھر نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم و یقین ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنھوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم ہے۔ یہ چیز ان کے ذوق جستجو کو شہ دیتی اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے، اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اجاگر کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے، وہ اس میں سے پا جاتے ہیں۔ جو دروازے کھلتے جاتے ہیں ان کے لیے، وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے، ان کو وہ اپنی قلت علم و نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتا، اور نہ کوئی شخص قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے محفوظ ہو سکتا۔ لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو کمزور نہیں کرتی، بلکہ ان کا ذوق جستجو برابر مشتعل رہتا ہے، اور وہ اس محنت سے جتنا کچھ بھی پاتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ جس نے بھی اس علم میں سے کوئی حصہ پایا ہے، اس نے اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ امام سیوطی اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں کہ:

''پہلے شخص جنھوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں۔ فقہ و ادب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔

۱۱؎ ۷۵:۱۹۔

۱۲؎ ۲۰:۱۱۴۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورت کے فلاں سورت کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے، اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں۔'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/۲۸۸)

امام سیوطی نے ابن عربی کا بھی مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

''آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔ اسی اصول پر اس نے پوری سورۂ بقرہ کو منظّم کر دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم پر یہ دروازہ کھولا، لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدردان نہیں پائے۔ ساری دنیا دوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے اس معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/۲۸۸)

یہی حال امام رازی کا ہے، وہ بھی جگہ جگہ تفسیر میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے۔ انھوں نے اس نعمت کی عظمت کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور اس کے مقابل میں اپنی بے مائیگی اور آلودگی کا جس درجہ ان کو احساس ہے، وہ ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ اس علم کو محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیتے ہیں اور اسی احساس کے ماتحت انھوں نے اپنی کتاب کا نام ''تبصیر الرحمان وتیسیر المنان'' رکھا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جن لوگوں نے اس علم میں سے کوئی حصہ پایا، ان کی نگاہوں میں اس کا یہ درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعترافات ان کی زبانوں سے اسی وقت نکلے ہوں گے، جبکہ انھوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہیں۔ جیسا کہ شیخ ولی الدین ملوی نے کہا ہے:

''جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لیے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں، لیکن ترتیب کے پہلو سے بالکل مطابق حکمت ہیں۔'' (الاتقان فی علوم القرآن ۲/۲۸۹)

اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے اندر اس کی مہک پا رہا ہو، اس کے جلوے دیکھ رہا ہو، اور اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو رہا ہو، وہ اس چیز کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں جس نے اس کا مزہ ہی نہ چکھا ہو، وہ اگر اس کا انکار کر دے تو وہ کچھ قابل الزام بھی نہیں۔

جو چیز مجھے لوگوں کے سامنے لانی ہے، اس کے متعلق اس طول بیان کی چنداں ضرورت نہیں تھی، لیکن میں نے یہ

تمہیداس لیے ضروری سمجھی کہ نظم کی جستجو تدبر کی محتاج ہے اور اگر تمھارے دماغ میں یہ بات جاگزیں ہے کہ قرآن مجید میں نظم سرے سے ہے ہی نہیں تو اس رائے کے ساتھ اس دشوار گزار وادی میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوگا۔ ہر چیز تمھیں بے گانہ معلوم ہوگی اور اس میں سر کھپانا طبیعت پر بہت بار ہوگا۔

ایک بات تم، البتہ پوچھ سکتے ہو کہ اگر نظم ایسی ہی عظیم الشان اور کثیر المنفعت چیز تھی تو آخر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق کیوں سکوت اختیار فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ آیات کا موقع ومحل صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمام تر انھی کے حالات اور انھی کے پیش نظر معاملات سے متعلق تھیں۔ اگر ہم بھی اس مبارک زمانہ میں ہوتے تو ان کا نظم ہمارے لیے بھی بالکل واضح ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے تفسیر بہت کم منقول ہے۔ زبان ان کی تھی، اسلوب ان کے تھے اور معاملات وحالات ان کے تھے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو۔ پھر نظم کے سمجھنے میں ہمارا اور ان کا حال یکساں کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود یہ ضرور ہے کہ کلام کی لپیٹ اور اس کی تہوں کے اندر ایسے اشارات موجود ہوتے ہیں جو آگے کی طرف انگلی اٹھاتے رہتے ہیں اور اگر آدمی کند ذہن نہ ہو، بلکہ کلام کے تمام اطراف میں پھیل کر آگے بڑھنے کا عادی ہو تو یہ اشارات نظم کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہم نے اپنی تفسیر کے بنیادی اصول نظم سے متعلق کہا ہے۔ اور یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مقدمات تفسیر کے سلسلہ میں بعض مفید مطلب اشارات اور ملیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ

عبد مناف بن قصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چوتھے اور حضرت عبیدہ بن حارث کے تیسرے جد تھے۔ان کے چار بیٹوں میں سے ایک ہاشم آپ کے پڑدادا تھے، آپ کا خاندان انھی کے نام پر بنو ہاشم کہلاتا ہے۔عبد مناف کے ایک بیٹے مطلب حضرت عبیدہ کے دادا اور ان کے پوتے حارث، حضرت عبیدہ کے والد تھے۔حضرت عبیدہ کی ولادت ۵۶۲ء میں ہوئی۔ان کی والدہ بنوثقیف سے تعلق رکھتی تھیں، سخیلہ بنت خزاعی ان کا نام تھا۔طفیل بن حارث اور حصین بن حارث ان کے سگے بھائی تھے، دونوں ان سے بیس سے زیادہ برس چھوٹے تھے۔ابو حارث یا ابو معاویہ حضرت عبیدہ کی کنیت تھی۔حضرت عبیدہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دس برس بڑے تھے، آپ کے والد کے چچازاد ہونے کی وجہ سے وہ آپ کے چچا ہوئے۔انھیں قریش کی شاخ بنوعبد مناف کے سردار ہونے کا شرف حاصل تھا۔

شہر مکہ میں ایک یہودی تاجر رہتا تھا۔جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی، وہ قریش کی مجلس میں گیا اور پوچھا: کیا آج رات تمھارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ کسی کو یہ خبر نہ تھی۔اس نے کہا: دھیان سے میری بات سنو، آج کی رات اس آخری امت کے نبی نے جنم لیا ہے۔اس کے کندھوں کے مابین گھوڑے کی ایال کی طرح بالوں کی جھالر ہے۔دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ پہلے دو دن دودھ نہ پیے گا۔مجلس منتشر ہونے کے بعد لوگ گھر گئے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے، جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا گیا ہے۔حاضرین محفل یہودی سے دوبارہ ملے اور بچے کے بارے میں بتایا۔وہ خود آپ کے گھر گیا اور سیدہ آمنہ سے بچہ دکھانے کو کہا۔مہر نبوت دیکھی تو بے ہوش ہو گیا۔افاقہ ہوا تو کہا: بخدا، نبوت بنی اسرائیل سے چھن گئی۔خوش ہو جاؤ، قریشیو،

تمھیں ایسا غلبہ حاصل ہوگا جس کی خبر مشرق و مغرب میں پھیل جائے گی۔تب ہشام بن مغیرہ، ولید بن مغیرہ، مسافر بن ابوعمرو، عقبہ بن ربیعہ اور دس سالہ عبیدہ بن حارث سامعین میں شامل تھے (مستدرک حاکم، رقم ۴۱۷۷)۔شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت عبیدہ بن حارث کا شمار اسلام کی طرف سبقت کرنے والے ان جلیل القدر اصحاب رسول میں ہوا جنھیں قرآن مجید نے السابقون الاولون (التوبہ ۹: ۱۰۰) کا نام دیا ہے۔آزاد مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے حضرت ابوبکر تھے، انھی کی دعوت پر حضرت عثمان نعمت ایمان سے سرفراز ہوئے۔اگلے ہی روز وہ حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ارقم بن ابوارقم، حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو بھی آپ کی خدمت میں لے گئے۔آپ نے دین حق کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا تو ان سب نے آپ کے دست مبارک پر بیعت ایمان کر لی۔تب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کی غرض سے دار ارقم میں منتقل نہ ہوئے تھے۔بعض روایات میں مخلصین کی اس فہرست میں حضرت عبیدہ کا نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔السابقون کی گنتی میں حضرت عبیدہ کا نمبر سولھواں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عبیدہ بن حارث اپنے بھائیوں طفیل بن حارث، حصین بن حارث اور رشتے میں اپنے بھتیجے مسطح بن اثاثہ کے ساتھ مل کر مدینہ ہجرت کے لیے نکلے۔مسطح پیچھے رہ گئے، کیونکہ ان کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔حضرت عبیدہ اور ان کے بھائیوں نے پلٹ کر ان کو ساتھ لیا اور قبا پہنچے۔وہاں یہ چاروں حضرت عبداللہ بن سلمہ عجلانی کے مہمان ہوئے۔ سویبط بن سعد، طلیب بن عمیر اور عتبہ بن غزوان کے آزاد کردہ خباب بھی ان کے ساتھ قیام پذیر ہوئے۔

ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض سے کہ مہاجرین مدینہ کی معاشرت میں گھل مل جائیں، انصار سے ان کی مواخات قائم فرمائی۔مشہور روایت کے مطابق پینتالیس مہاجرین کا پینتالیس انصار سے بھائی چارہ قائم ہوا۔شاذ روایت میں طرفین میں سے ہر ایک کا عدد پچاس بیان کیا گیا ہے۔مواخات میں شامل افراد کو ایک دوسرے کی وراثت کا حق حاصل تھا۔جنگ بدر کے بعد 'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ'، ''اور رشتۂ رحم رکھنے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں'' (الانفال ۸: ۷۵) کا حکم نازل ہوا تو یہ حق منسوخ ہو گیا۔حضرت عمیر بن حمام انصاری حضرت عبیدہ بن حارث کے درمیان انصاری بھائی قرار پائے۔ابن سعد نے حضرت بلال سے بھی ان کا مواخات کا ذکر کیا ہے۔شاید یہ مکہ کا واقعہ ہو۔

مدینہ تشریف آوری کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں زمین تقسیم کی تو حضرت عبیدہ اور ان کے بھائیوں ـــــ طفیل اور حصین ـــــ کو وہ قطعہ عطا کیا جو بقیع زبیر اور بنو مازن کے علاقے کے درمیان واقع تھا۔بعد میں

اسے مسجد نبوی میں شامل کر لیا گیا اور اسی مقام پر آپ کا منبر رکھا گیا۔

سریۂ عبیدہ بن حارث: شوال ۱ھ (ربیع الاول: ابن عبدالبر، ان کے سوا سب نے ماہ شوال بتایا ہے) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبیدہ بن حارث کی قیادت میں ساٹھ (یا اسی) مہاجرین کا ایک دستہ ترتیب دیا۔ حضرت عبیدہ کو عہد اسلامی کا پہلا پرچم عنایت کر کے آپ نے بطن رابغ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ سفید علم کو مسطح نے اٹھا رکھا تھا۔ مکہ کی طرف جانے والے راستے پر واقع جحفہ سے دس میل آگے ثنیۃ المرۃ کے زیریں علاقے میں احیا (احبا: بیہقی) نامی جھیل پر اس دستے کی مشرکوں کے دو سو پر مشتمل ایک بڑے جتھے سے مڈبھیڑ ہوئی جس کی سربراہی ابوسفیان بن حرب (ابن سعد) یا عکرمہ بن ابوجہل (ابن اسحاق) یا مکرز بن حفص کے پاس تھی۔ اسلام کی آمد کے بعد یہ پہلا سریہ تھا جس میں جنگ ہوئی نہ تلوار سونتی گئی۔ محض آمنا سامنا ہوا اور سعد بن مالک (ابی وقاص) نے تاریخ اسلامی کا پہلا تیر پھینکا۔ اسی سریہ میں حضرت مقداد بن عمرو (اسود) اور حضرت عتبہ بن غزوان جو حیلہ کر کے کفار کے ساتھ آئے تھے، اپنے مسلمان بھائیوں سے آن ملے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابن اسحاق کی بیان کردہ اس تفصیل کے برعکس جسے ابن کثیر نے ترجیح دی، واقدی اور ابن سعد کا کہنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آمد کے بعد تاریخ اسلامی کا پہلا علم سیدنا حمزہ کو عطا کیا تھا۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ کے سریے ایک ساتھ روانہ کیے گئے تھے، اس لیے اس باب میں اہل تاریخ میں اختلاف رونما ہو گیا۔ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں یوں تطبیق کی: پرچم کے لیے عربی میں دو لفظ 'رأیة' اور 'لواء' آتے ہیں۔ حضرت عبیدہ کے لیے 'رأیة' اور حضرت حمزہ کے لیے 'لواء' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے، دونوں کی اولیت اس خاص نام کے حوالے سے درست ہو۔

جمادی الثانی ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تجارتی سرگرمیوں کی خبر لینے کے لیے نو مہاجرین کا ایک سریہ روانہ فرمایا۔ ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ پہلے آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح یا حضرت عبیدہ بن حارث کا تقرر کیا تھا۔ روانگی کے وقت وہ فرط جذبات سے رونے لگے تو آپ نے اس سریہ کی سربراہی حضرت عبداللہ بن جحش کو سونپ دی۔ چنانچہ یہ انھی کے نام سے موسوم ہوا۔

غزوۂ بدر (۱۷ رمضان ۲ھ، ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کے دن، جسے اللہ تعالیٰ نے یوم فرقان (الانفال ۸: ۴۱) قرار دیا ہے، ۳۱۳ اہل ایمان بدر کے میدان میں پہنچے۔ حضرت عبیدہ بن حارث عمر میں ان سب سے بڑے تھے، پھر بھی سیدالشہدا حضرت حمزہ اور حضرت علی کے ساتھ مل کر قریش سے مبارزت کی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے مشرک

لیڈروں ـــــ حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ ـــــ نے سریۂ عبد اللہ بن جحش میں مارے جانے والے عمرو بن حضرمی کی دیت لے کر مکہ واپس لوٹنے کا مشورہ دیا۔ ابوجہل نے انھیں خوب طعن و تشنیع کی اور عمرو کے بھائی عامر بن حضرمی سے کہا کہ اپنے بھائی کا بین کر کے لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرو۔ عتبہ ابن حضرمی کا حلیف تھا، اس لیے اب جنگ کرنے پر مجبور تھا۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق اسی اثنا میں عامر نے حضرت عمر کے غلام مہجع کو تیر مارا تو انھوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ایک انصاری حضرت حارثہ بن سراقہ بھی، جو حوض کے پاس کھڑے تھے، مشرکوں کا تیر لگنے سے شہید ہوئے۔ ابن اسحاق اور ابن اثیر کی روایت مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ مبارزت سے پہلے مشرکین میں سے اسود بن عبد الاسد آگے بڑھا تو سیدنا حمزہ نے اس کی ٹانگ کاٹ ڈالی۔ وہ لڑکھڑا کر پانی کے حوض میں گرا تو انھوں نے دوسرا وار کر کے انجام تک پہنچایا۔ پھر عتبہ جوش میں آیا، سر پر چادر لپیٹی اور اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹے ولید کو لے کر رو برو مقابلے (duel) کے لیے نکل آیا۔ اس کے للکارنے پر انصار کے تین نوجوان حضرت عوف، حضرت معوّذ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر) یا معاذ (ابن سعد) آگے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہ کیا کہ قریش کا پہلا قتال انصار سے ہو، آپ نے سبقت کرنے والے انصاریوں کو صفوں میں واپس جانے کو کہا۔ ادھر عتبہ نے آواز لگائی: محمد، ہماری قوم قریش میں سے، ہمارے چچیروں، عبد المطلب کی اولاد سے برابر کے جوڑ بھیجو۔ آپ پکارے: اے بنی ہاشم، اٹھ کر مقابلہ کرو، اٹھو، اے عبیدہ بن حارث، اٹھو، اے حمزہ، اٹھیے، علی، تینوں نکل کر آئے تو اس نے ان کے نام پوچھے، کیونکہ جنگی لباس پہننے کی وجہ سے وہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ حضرت حمزہ نے کہا: میں شیر خدا اور شیر رسول حمزہ بن عبد المطلب ہوں۔ حضرت علی نے کہا: میں بندۂ خدا اور برادر رسول علی بن ابو طالب ہوں۔ حضرت عبیدہ نے کہا: میں حلیف رسول عبیدہ بن حارث ہوں۔ عتبہ بولا: اب برابر کے، صاحب شرف لوگوں سے جوڑ پڑا ہے۔ اولاً، اس نے اپنے بیٹے ولید کو بھیجا، حضرت علی اس کے مقابلے پر آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر تلوار سے وار کیا۔ ولید کا وار خالی گیا، جبکہ حضرت علی نے ایک ہی ضرب میں اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر عتبہ خود آگے بڑھا اور حضرت حمزہ اس کا سامنا کرنے نکلے۔ ان دونوں میں بھی دو ضربوں کا تبادلہ ہوا اور عتبہ جہنم رسید ہوا۔ اب شیبہ کی باری تھی، حضرت عبیدہ بن حارث سے اس کا دو بدو مقابلہ ہوا، دونوں نے ایک دوسرے پر کاری ضربیں لگائیں۔ حضرت عبیدہ کی پنڈلی پر تلوار لگی اور ان کا پاؤں کٹ گیا۔ جنگی روایت کے مطابق حضرت حمزہ اور حضرت علی فاتح ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھی کی مدد کر سکتے تھے۔ دونوں پلٹ کر شیبہ پر پل پڑے، اسے جہنم رسید کیا اور زخمی حضرت عبیدہ کو اس حال میں اٹھا کر لے آئے کہ ان کی ٹانگ کی نلی سے گودا بہ رہا تھا۔ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جایا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

گیا۔ آپ نے انھیں لٹا دینے کو کہا، حضرت عبیدہ نے آپ کے پاؤں پر سر رکھ کر پوچھا: یا رسول اللہ، کیا میں نے شہادت نہیں پائی؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عبیدہ نے کہا: یا رسول اللہ، مجھے اگر ابو طالب دیکھ لیتے تو جان لیتے کہ میں ان کے کہے اس شعر کا صحیح مصداق ہوں:

ونسلمه حتى نصرع حوله   ونذهل عن ابنائنا والحلائل

(اصل میں 'لا نسلمه' ہے۔ چونکہ لائے نفی حذف نہیں ہوتا اس لیے 'نسلمه' کا جملہ کسی سابق منفی پر عطف ہو گا اور 'لا' مقدر ماننے کی ضرورت نہ رہے گی۔ شعر کا مفہوم ہو گا، ہم اپنے سالار کو (یہاں مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے) دشمنوں کے نرغہ میں نہیں آنے دیتے، یہاں تک کہ اس کے گرد اگرد لڑ کر جان دے دیتے ہیں اور اس جدوجہد میں اپنے بیٹوں اور بیویوں کی حفاظت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ''سیرت النبی'' میں شبلی نعمانی نے فعل مثبت مان کر یوں ترجمہ کیا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں سے بھلا نہ دیے جائیں)۔

مورخین کی اکثریت نے جن میں ابن اسحاق، طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر شامل ہیں، بیان کیا ہے کہ حضرت حمزہ کا مقابلہ (duel) شیبہ سے ہوا اور حضرت حمزہ نے شیبہ کو جہنم رسید کیا۔ اس طرح عتبہ اور حضرت عبیدہ میں دوبدو جنگ ہوئی، دونوں زخمی ہوئے۔ پھر حضرت علی اور حضرت حمزہ نے مل کر عتبہ کو انجام تک پہنچایا۔ ابن سعد کی روایت اس کے برعکس ہے، ان کا کہنا ہے کہ روبرو مقابلے کے بعد حضرت حمزہ نے عتبہ کو قتل کیا، جبکہ شیبہ نے حضرت عبیدہ کا سامنا کیا۔ یہ روایت منفرد ہونے کے باوجود اس لیے لائق ترجیح ہے کہ اسی جنگ میں ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہ سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم کھائی، کیونکہ وہ انھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اگلے برس جنگ احد میں جب سیدنا حمزہ حبشی غلام وحشی کا نیزہ لگنے کے بعد شہادت سے سرفراز ہوئے تو اسی انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا کر اگل دیا۔ سنن ابوداؤد کی روایت ۲۶۶۵ میں ایک تیسری ترتیب مذکور ہوئی ہے۔ سیدنا علی خود روایت کرتے ہیں کہ ''حمزہ عتبہ کی طرف بڑھے اور میں (علی) نے شیبہ کا سامنا کیا۔ عبیدہ اور ولید میں دو ضربوں کا تبادلہ ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کو شدید زخمی کر کے گرا دیا۔ پھر حمزہ نے اور میں نے ولید کو قتل کیا اور عبیدہ کو اٹھا لائے۔'' مسند احمد، مسند علی بن ابی طالب (رقم ۹۴۸) میں حضرت علی کے الفاظ میں جنگ بدر کی تفصیل بیان ہوئی ہے، تاہم مبارزت کے ضمن میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

زخمی ہونے کے بعد حضرت عبیدہ نے خود بھی شعر کہے۔ ان میں سے چند پیش خدمت ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ستبلغ عنا أهل مكة وقعة   يهب لها من كان عن ذاك نائيا

''جلد ہی مکہ والوں کو ہماری طرف سے ایک زبردست معرکے کی خبر ملے گی جسے سننے کے لیے واقعہ سے دور بیٹھا ہوا شخص بھی بیدار ہو جائے گا۔''

بعتبة إذ ولى و شيبة بعده   و ما كان فيها بكر عتبة راضيا

''عتبہ کے انجام کے بارے میں جب اس نے شکست کھائی، اس کے بعد شیبہ کے ساتھ بھی یہی ہوا اور اس معرکہ میں عتبہ کے پہلوٹھی ولید کے ساتھ وہ ہوا جو وہ نہ چاہتا تھا۔''

لقيناهم كالأسد نخطر بالقنا   نقاتل في الرحمٰن من كان عاصيا

''ہم نے ان کا شیروں کی طرح سامنا کیا خدائے رحمٰن کی راہ میں ان لوگوں سے لڑتے ہوئے جو اس کے نافرمان تھے۔''

فإن تقطعوا رجلي فإني مسلم   أرجي بها عيشًا من الله دانيا

''اگر تم مشرکوں نے میرا پاؤں کاٹ ڈالا ہے تو کیا؟ میں نے اسلام قبول کر کے اس زندگی کی امید میں سر تسلیم خم کر دیا ہے جو اللہ کی طرف سے جلد ملنے والی ہے۔''

مع الحور أمثال التماثيل أخلصت   مع الجنة العليا لمن كان عاليا

''مجسموں کی مانند ان حوروں کی معیت میں جو اعلیٰ جنت میں خاص اس شخص کو ملیں گی جو مقام بلند پر فائز ہو گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت علی فرماتے ہیں: ''میں پہلا شخص ہوں گا جو روز قیامت فیصلے کے لیے روز خدائے رحمٰن کے روبرو دوزانو ہو گا۔'' حدیث کے راوی قیس بن عباد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیت 'هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِيۡ رَبِّهِمۡ'، ''یہ (مومن و موحد) دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں اختلاف کیا۔'' (الحج ۲۲: ۱۹) ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنھوں نے جنگ بدر میں مبارزت کی، یعنی حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت عبیدہ بن حارث، اور شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ (بخاری، رقم ۳۹۶۵۔ مسلم، رقم ۷۶۶۵)۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ حضرت علی کے اس قول کے معنی یہ ہیں کہ وہ امت مسلمہ کے مجاہدین میں اولیت رکھتے ہیں، کیونکہ جنگ بدر کے آغاز میں ہونے والی مبارزت تاریخ اسلامی کی پہلی مبارزت تھی جس میں حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ نے حصہ لیا اور حضرت عبیدہ مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ اس لحاظ سے حضرت علی کا قول اس آیت کے ایک خاص معنی پر مشتمل ہوا۔ علی الاطلاق صحیح مفہوم وہی ہے جو اہل تفسیر نے بیان کیا۔ مجاہد اور عکرمہ کہتے ہیں کہ کفار و مشرکین نے مسلمانوں سے بعث بعد الموت اور جنت و دوزخ پر جھگڑا کیا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب کا اہل ایمان سے نزاع

ہوا۔اہل کتاب نے کہا کہ ہمارے نبی تمھارے نبی سے پہلے آئے اور ہماری کتاب تمھاری کتاب سے پہلے نازل ہوئی، اس لیے ہم حق پر ہوئے۔اہل ایمان کا جواب تھا کہ ہماری کتاب نے تمام کتابوں کی شرعی حیثیت ختم کر دی ہےاور ہمارے نبی نے سلسلۂ نبوت کا خاتمہ کر دیا ہے۔اس طرح ہمارا حق پر ہونا ثابت ہو گیا۔

حضرت عبیدہ کے دونوں بھائی — طفیل بن حارث اور حصین بن حارث — بھی جنگ بدر میں شریک تھے۔

حضرت عبیدہ بن حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر سے لوٹ آئے، لیکن مدینہ نہ پہنچ پائے۔ جنگ بدر کے دو دن بعد زخموں کی تاب نہ لا کر مدینہ کے قریب وادی صفراء میں شہادت پائی اور اسی وادی میں ذات اجذال کے مقام پر سپرد خاک ہوئے۔ان کی بھتیجی ہند بنت اثاثہ کے مرثیہ کے الفاظ میں، شرف و سرداری اور عقل و دانش کو صفراء میں دفن کر دیا گیا۔حضرت عبیدہ کی عمر ۶۳ سال ہوئی۔عبیدہ میانہ قد، گندم گوں اور خوب رو تھے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبیدہ بن حارث کا بہت احترام کرتے تھے۔آپ کے ہاں انھیں ایک مرتبہ حاصل تھا۔ایک مرتبہ آپ اپنے صحابۂ کرام کے ساتھ تاربین کے مقام پر رکے تو صحابۂ کرام نے کہا کہ ہمیں مشک کی خوشبو آ رہی ہے۔آپ نے فرمایا: ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ یہاں ابومعاویہ (عبیدہ بن حارث) کی قبر ہے۔ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' میں تاربین ہی لکھا ہے، شاید اس سے تربان مراد ہے جو مدینہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع ملل کے مقام پر ایک قصبہ ہے جہاں جنگ بدر کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام کیا تھا۔

ام المومنین زینب بنت خزیمہ جو اپنی غربا پروری کی وجہ سے ام المساکین کہلاتی ہیں، پہلے اپنے چچازاد جہم بن عمرو کے نکاح میں تھیں، پھر حضرت عبیدہ بن حارث کے بھائی طفیل بن حارث سے ان کی شادی ہوئی۔طفیل نے طلاق دے دی تو حضرت عبیدہ سے ان کا عقد ہوا۔حضرت عبیدہ کی شہادت کے بعد رمضان ۳ھ میں انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہوا۔آپ کے پاس آٹھ ماہ کا مختصر عرصہ گزارنے کے بعد حضرت زینب نے وفات پائی، جبکہ ان کی عمر تیس برس تھی۔ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہ حضرت عبیدہ بن حارث کے بجائے حضرت عبداللہ بن جحش کے عقد میں تھیں۔

معاویہ، عون، منقذ، حارث، محمد اور ابراہیم عبیدہ کے بیٹے تھے، جبکہ ریطہ، خدیجہ، سخیلہ اور صفیہ ان کی بیٹیاں تھیں۔ ابن سعد کے مطابق ان دس بچوں کی ولادت مختلف باندیوں (امہات اولاد) کے بطن سے ہوئی۔ان کی اہلیہ حضرت زینب بنت خزیمہ کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری)، تاریخ الامم

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

والملوک (طبری)، دلائل النبوۃ (بیہقی)،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)،المنتظم فی تواریخ الملوک و الامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)،الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)،تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیر)،تاریخ الاسلام (ذہبی)،الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، فتح الباری (ابن حجر)،الامین صلی اللہ علیہ وسلم (رفیق ڈوگر)،Wikipedia۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رضوان اللہ

نشوز اور اس کا علاج

مردوں کی سربراہی کے تقاضے بیان ہو چکنے کے بعد اب اُن عورتوں کا معاملہ زیر بحث آیا ہے جو سربراہی کے اِن تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہوں اور ان کے رویوں میں اس قدر بگاڑ آ چکا ہو کہ خاندان کی اس چھوٹی سی ریاست میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہو۔ فرمایا ہے:

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ فَعِظُوۡھُنَّ وَاھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡھُنَّ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡھِنَّ سَبِیۡلًا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا. (النساء۴:۳۴)

''اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو اور ان کے بستروں پر انھیں تنہا چھوڑ دو اور انھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کا رویہ اختیار کر لیں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔''

یہاں شروع کلام میں، یعنی 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ' میں دو الفاظ خصوصاً قابل غور ہیں: پہلا لفظ 'نُشُوۡز' کا اور دوسرا 'تَخَافُوۡنَ' کا۔ 'نُشُوۡز' کے بارے میں معلوم ہے کہ اس سے عورت کی ہر طبعی و ذوقی حکم عدولی مراد نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مراد وہ نافرمانیاں ہوتی ہیں کہ جن کے نتیجے میں مرد کی سربراہی بذات خود زیر بحث آ جاتی، حتیٰ کہ اس کے ختم ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔[1] لہٰذا، بات بات پر جھگڑا اُٹھانے اور پھر اسی بنیاد پر عورت کا استحصال

---

[1] 'نُشُوۡز' کی اصل، اِرتفاع اور بلندی ہے اور مرد کے مقابل میں عورت کی سرکشی کے لیے اس کا استعمال عربی زبان میں حد درجہ معروف ہے۔ حوالے کے لیے ''لسان العرب'' اور ''مختار الصحاح'' کی مراجعت کی جا سکتی ہے۔

کرنے والوں سے یہ آیت متعلق ہے اور نہ اس میں ان کی موافقت کے لیے کچھ سامان ہی موجود ہے۔ دوسرا لفظ 'تَخَافُوْنَ' کا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ عورت کی اس سرکشی کے عملاً واقع ہو جانے اور اس کے نتیجے میں سب کچھ تلپٹ ہو جانے کا مرد انتظار نہ کرے، بلکہ جب عورت کے رویے میں سرکشی کی علامتیں اور بغاوت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوں، اسی وقت سے وہ توجہ دے اور اس سے نمٹنے کے لیے آیت زیر بحث میں بیان کردہ تدابیر کو اختیار کرے۔ یہ تدابیر جو تین کی تعداد میں بتائی گئی ہیں، ذیل میں ہم ان کا بیان ذرا تفصیل سے کرتے ہیں:

پہلی تدبیر

ہر اُلجھے ہوئے معاملے کو سلجھانے کی ابتدا چونکہ افہام و تفہیم سے ہوتی ہے، اس لیے نشوز کے حل کے لیے بھی پہلی اصلاح یہی تجویز ہوئی۔ ارشاد ہوا ہے: 'وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ' (جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو)۔ نصیحت کے لیے یہاں 'وَعْظ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ عربی زبان میں ایسی نصیحت کے لیے آتا ہے جس میں محض سمجھا دینا ہی نہیں، بلکہ اس میں معاملے کی سنگینی اور اس کے برے انجام کی آگہی دے دینا بھی پیش نظر ہوتا ہے[2]۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس لفظ کے مفہوم میں ایک طرح کی تنبیہ اور زجر کا عنصر بھی شامل ہے۔ سو 'فَعِظُوْھُنَّ' کے الفاظ مرد کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ عورت کی سرکشی پر اس کو تنبیہ کرے، اسے معاملے کی نوعیت اور اس کے نتائج سے خبردار کرے اور اگر کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنی پڑ جائے تو وہ بھی ضرور کرے کہ ایسا کرنا دراصل، 'فَعِظُوْھُنَّ' کی ہدایت ہی پر عمل کرنا ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسری تدبیر

'فَعِظُوْھُنَّ' کی تدبیر پر مرد نے خوب عمل کیا اور عورت کو اچھی خاصی نصیحت کی، مگر حاصل اس سے کچھ بھی نہ ہوا اور عورت کا سابقہ رویہ اسی طرح برقرار رہا تو اب یہ ہدایت ہوئی کہ وہ دوسری تدبیر پر عمل کرے۔ 'وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ'، یعنی اسے اس کے بستر پر تنہا چھوڑ دے۔ بستر پر تنہائی اصل میں ہم بستری نہ کرنے سے کنایہ ہے، اس لیے کہ محض بستر پر تنہا چھوڑ دینا، حکم کا منشا ہے اور نہ اس کا کچھ فائدہ ہے۔ تاہم یہ بات واضح رہے کہ مرد کو جنسی لاتعلقی

---

[2] یہی وجہ ہے کہ اہل لغت اس کا معنی بتاتے ہوئے 'النصح' کے ساتھ، بالعموم 'التذکیر بالعواقب' کے الفاظ بھی لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابن منظور ''لسان العرب'' میں۔

کی یہ ہدایت اس لیے نہیں دی گئی کہ وہ عورت کو زچ کرے یا اسے کسی اذیت میں مبتلا کر دے، بلکہ اس سے مقصود درحقیقت یہ ہے کہ عورت سے ناراضی کا اظہار کیا جائے اور اس کی سرکشی کو سہارا دینے میں جو اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد شے ہو سکتی ہے، اس کو ایک طرح سے زک پہنچائی جائے۔ یہ معلوم سچائی ہے کہ مرد کے مقابل میں عورت کا سب سے مجرب نسخہ اور سب سے کارگر ہتھیار، ہم بستری کی یہ حالت ہی ہے۔ یہ اسی کے برتے پر مرد کو تگنی کا ناچ نچا دے سکتی، اسے آغوش سے اٹھا کر اپنے قدموں میں گرا دے سکتی اور حدیث کے الفاظ میں اچھے خاصے دانا و بینا کی عقل کو بھی ماؤف کر کے رکھ دے سکتی ہے۔[۳] 'وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ' کی ہدایت اس کے اسی غرور پر ایک طرح کی چوٹ ہے جو اسے یہ بات بھی باور کرا دیتی ہے کہ اس کا مرد اس معاملے میں کس قدر سنجیدہ ہے اور اس کی ہر عشوہ گری کی پروا کیے بغیر کس آخری حد تک وہ جا سکتا ہے۔

تیسری تدبیر

اگر کسی کی عورت ہٹ کی پکی ہے اور اُس کی طبیعت ایسی ہے کہ سمجھانے کا کچھ اثر لیتی ہے اور نہ خلوتوں میں تنہا رہ جانے پر کسی طرح پسیجتی ہے تو ایسی صورت حال میں بھی خاندان کے ادارے کو قائم رکھنا اس قدر پیش نظر ہے کہ قرآن نے تیسری تدبیر کے طور پر اسے سزا تک دینے کی ہدایت کر دی ہے۔ فرمایا ہے: 'وَاضْرِبُوْهُنَّ'، یعنی مرد اپنی عورت کو سزا دے۔ سزا کی تعیین میں اصل حیثیت معلوم ہی ہے کہ سزا کے حکم کے مخاطب اور اس کے مقصد کو حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر باپ اور تھانیدار کو جب حق ضرب دیا جائے گا تو یہ آپ سے آپ متعین ہو جائے گا کہ باپ نے محض گوشمالی کرنی ہے اور تھانیدار نے خوب پٹائی کرنی ہے۔ چنانچہ 'وَاضْرِبُوْهُنَّ' میں جس سزا کا ذکر ہے، وہ کسی قسم کا تشدد نہیں، اس لیے کہ سزا کی یہ ہدایت شوہر کو ہو رہی ہے نہ کہ کسی ظالم جلاد کو، اور عورت کے نشوز کی علامتیں ختم کرنے کے لیے ہو رہی ہے نہ کہ خود اسے ختم کر دینے کو۔

مرد کو بحیثیت سربراہ کیا سزا دینے کا حق ہے بھی؟ اس بات پر کچھ عرصہ پہلے تک علما اور غیر علما، دونوں کو کوئی خاص اعتراض نہ تھا، مگر آج بہت سے حضرات اس سے انتہائی متوحش ہیں اور اس کو کسی بھی طرح مان کر دینے کو تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ اس حکم میں طرح طرح کی تاویلات پیدا کرتے اور اس پر نت نئے اعتراضات اٹھاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی تاویلات اور ان کے اعتراضات اور ان کی اصل حقیقت کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں:

---

۳ مسلم، رقم ۲۵۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ا۔ کچھ صاحبان کا خیال ہے کہ 'وَاضْرِبُوْھُنَّ' اصل میں کسی سزا اور مار کا بیان ہے ہی نہیں۔ یہ تو عربی زبان کے ایک محاورے، یعنی ضرب مثل کا بیان ہے کہ جس کا مطلب کسی بات کو مثالوں کے ذریعے سے سمجھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو علما اس لفظ سے عورت کو سزا دینے کا جواز ثابت کرتے ہیں، وہ درحقیقت عربی زبان سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت فراہم کرتے اور قرآن کی منشا کے بالکل خلاف ایک عمل کرتے ہیں۔

اس تاویل پر ذیل کے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ ضرب مثل تو واقعتاً عربی زبان کا محاورہ ہے اور اس کا معنی بھی مثال بیان کرنا ہی ہے، مگر 'وَاضْرِبُوْھُنَّ' میں بھی 'ضَرَبَ' کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے، اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان میں اور خود قرآن مجید میں بھی اس محاورے کا استعمال بتاتا ہے کہ جب یہ مثالیں بیان کرنے کے معنی میں آئے تو ہمیشہ اپنے فعل کے لیے ایک مفعول اور اپنے متعلق کے لیے ایک صلے کا تقاضا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ کہف میں یہ اس طرح آیا ہے: 'وَاضْرِبْ لَھُمْ مَّثَلًا'[4]، یعنی آپ ان کے لیے ایک مثال بیان کیجیے۔ 'وَاضْرِبُوْھُنَّ' میں بھی جو حضرات اس کو اسی معنی میں لینا چاہیں، انھیں دو سوالوں کا جواب ضرور دینا ہوگا: ایک اس سوال کا کہ 'اِضْرِبُوْا' کا مفعول، یعنی 'مَثَلًا' یا پھر 'الأمثال'، وہ کہاں ہے؟ دوسرا یہ کہ 'اِضْرِبُوْا' کے متعلق، یعنی 'ھُنَّ' کے ساتھ 'ل' کا صلہ کیوں نہیں ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر معنی یہی ہے کہ ان عورتوں کو مثالوں سے سمجھاؤ تو پھر 'وَاضْرِبُوْھُنَّ' کے بجائے یہاں 'واضربوا لھن الامثال' کے الفاظ کیوں نہیں ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ 'اِضْرِبُوْا' کے مفعول کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ اس کا مفعول یہاں ہے تو سہی، مگر وہ لکھنے میں حذف ہو گیا ہے، تو اس پر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ وہ کون سا قرینہ ہے جو اس حذف پر آپ کی رہنمائی کر رہا ہے؟ کیونکہ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی قرینہ موجود ہونا تو دور کی بات، الٹا یہاں دو عدد قرینے اس بات کے پائے جاتے ہیں کہ یہاں امثال جیسا کوئی مفعول، کسی بھی صورت میں محذوف نہیں ہے: پہلا یہ کہ نصیحت کے عمل میں مثالوں سے بات کو سمجھانا شامل ہے، اس لیے 'فَعِظُوْھُنَّ' کے بعد پھر اس کا بیان کر دینا بہر حال ایک حشو ہے اور قرآن کی شان سے یہ انتہائی فروتر ہے۔ دوسرا یہ کہ نشوز کے حل کے لیے تجویز کردہ ان تینوں تدابیر میں ایک ترتیب ہے جو اگر غور کیا جائے تو نرمی سے سختی کی طرف ہے، اس لیے نصیحت کرنے اور ہم بستری تک سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب اس سے سخت تر کسی عمل کی ہدایت تو ہوسکتی ہے، مگر پھر واپس نصیحت پر لوٹ آنے کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے۔

---

[4] ۱۸: ۳۲۔ سورۂ کہف ہی کی آیت ۴۵ میں اور یٰس (۳۶) کی آیت ۱۳ میں بھی یہ اسی طرح آیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ کچھ حضرات کے ہاں 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کا معنی تو سزا دینا ہی ہے، مگر اس کا حق مرد کو نہیں، بلکہ جماعت کو یا دوسرے لفظوں میں، ملک کی عدالتوں کو حاصل ہے۔ اس کی پہلی دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ' میں مرد و زن، دونوں کا ذکر غیب کے اسلوب میں ہوا، مگر اس کے بعد 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' میں براہ راست معاشرے کو خطاب کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کی ہدایت بھی اصل میں معاشرے ہی سے متعلق ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس سے اگلی آیت میں 'وَاِنۡ خِفۡتُمۡ' کے جو الفاظ ہیں، کم و بیش سب علما کے ہاں ان کے ذریعے سے میاں بیوی کو نہیں، بلکہ معاشرے کی اجتماعیت ہی کو خطاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سزا دینے کا یہ حکم معاشرے ہی سے متعلق ہے۔[۵]

ان حضرات کی پہلی بات کے جواب میں عرض ہے کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ' میں مرد و زن کا ذکر غیب کے اسلوب میں کرنے کے بعد 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' میں مردوں سے جو براہ راست خطاب ہو گیا ہے تو اس کے دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: 'والتی یخافون نشوزهن فلیعظوهن ولیهجروهن فی المضاجع ولیضربوهن'۔ اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی سلاست اس قدر ثقل اور سکتوں کی متحمل ہو نہیں سکتی تھی، اس لیے اس متوقع اسلوب کو لازماً بدلنا ہی تھا۔ دوسرا یہ کہ 'وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ' سے پہلے تک مرد کی قوامیت، اس کے دلائل اور اس کے تقاضوں کا بیان ہو رہا تھا اور اپنے اندر تعلیم کا پہلو رکھنے کی وجہ سے ان کا غیب کے اسلوب میں آنا ہی زیادہ موزوں تھا، اس کے بعد جب بات تعلیم سے آگے بڑھ کر کچھ کچھ نزاعی ہو گئی کہ جس میں مرد کو کچھ تدبیریں تجویز ہونی ہیں تو ضروری تھا کہ اب اسلوب کو بدل دیا جاتا۔

ان کی دوسری بات کے جواب میں عرض ہے کہ قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ اپنے انداز بیان میں خطبے کی صنف سے زیادہ مشابہ ہے، اس لیے اس میں جس طرح خطاب کی نوعیت بدلتی ہے، اسی طرح مخاطب بھی بار بار بدلتا ہے۔ مزید یہ کہ کس جگہ کس سے خطاب کیا گیا ہے، اس کی واحد دلیل اس کلام کا سیاق اور خود خطاب کی نوعیت ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس آیت میں: 'وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ'[۶]۔ اس

۵؎ دراں حالیکہ اس بات میں کیا فرق ہے کہ نشوز کی سزا شوہر دے یا پھر کسی ملک کی عدالت۔ ہر دو صورت میں عورت کو سزا دینے کی بات تو ماں ہی لینا پڑتی ہے۔

۶؎ البقرہ ۲: ۲۲۹۔ ''اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس لو، مگر اس

میں ہر کسی کے لیے یہ واضح ہے کہ 'وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ' اور اس کے بعد 'فَاِنْ خِفْتُمْ' کے الفاظ، اپنی ظاہری مشابہت کے باوجود، بالترتیب شوہر اور معاشرے ہی سے خطاب کر رہے ہیں۔ 'فَاِنْ خِفْتُمْ' میں معاشرے سے خطاب ہے، اس لیے کہ یہاں سے قانونی اور عدالتی کارروائی کا بیان ہو رہا ہے اور 'وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ' میں شوہروں سے خطاب ہے، اس لیے کہ مال بیویوں کو وہی دیا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح زیر بحث آیت میں بھی اگر سیاق اور نوعیت خطاب، دونوں پر نظر رہے تو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ 'وَاِنْ خِفْتُمْ' کے الفاظ میں جب یہ حکم دیا گیا کہ میاں بیوی کے خاندان میں سے ایک ایک حَکَم مقرر کیا جائے تو اس حکم کی نوعیت ہی نے واضح کر دیا کہ یہ الفاظ معاشرے ہی کو خطاب کر رہے ہیں۔ لیکن 'فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ' کی ایک ہی تسلسل میں بیان ہوئی ہدایات میں جب ہم بستری نہ کرنے کی ہدایت بھی ہوئی تو اس کی بھی نوعیت ہی نے واضح کر دیا کہ یہ تینوں ہدایات بہر حال شوہروں ہی سے متعلق ہیں۔ خطاب کی نوعیت کا یہ وضوح ہی ہے کہ بعض لوگوں کو مذکورہ رائے میں تغیر کرتے ہوئے یہ موقف اپنانا پڑا ہے کہ نصیحت کرنے اور ہم بستری نہ کرنے کی ہدایات شوہر ہی کو دی گئی ہیں، البتہ سزا دینے کی ہدایت صرف اور صرف اولی الامر کو ہے، دراں حالیکہ ایک ہی سیاق اور ایک ہی رو میں کہی ہوئی باتوں میں اس طرح کی تفریق کرنا اس وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے، جب قرآن مجید کو ایک فصیح اور بلیغ کلام کے بجاے چیستاں قسم کی کوئی چیز سمجھ لیا جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ عورت ذات کو مارنا، دراصل اس پر ظلم توڑنے کی ایک قدیم مردانہ روایت تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے اور کسی مہذب معاشرے میں اس کا تصور کر لینا بھی اب محال ہے۔ اور پھر یہ کہ عورت نکاح میں باقاعدہ فریق معاملہ ہے، اس لیے دوسرے فریق کا یہ حق تو ہے کہ وہ گفت وشنید سے بگڑے ہوئے مسائل کو حل کرے، مگر اسے یہ حق بالکل بھی نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرنے اور تشدد کرنے پر اتر آئے۔

اس کے جواب میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہییں: پہلی یہ کہ مرد کو حق ضرب دینا، یہ عورت پر کسی قسم کا ظلم ہے اور نہ قرآن مجید ہی کا یہ منشا ہے کہ کسی ذی روح پر، بالخصوص عورت کی ذات پر، ظلم روا رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ سزا دینے کی اس تدبیر پر عمل کرنے میں جن دشواریوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ سب آیت کا مدعا صحیح طور پر نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہماری ان باتوں کی تفصیل یہ ہے:

صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔''

اولاً، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ خاندان کا ادارہ اپنی حقیقت میں ایک ریاست سے مشابہ ہے اور ریاست کے بارے میں ہم سب مانتے ہیں کہ اگر اس میں بغاوت ہو جائے تو اس کو فرو کرنے کے لیے وہ اپنے شہریوں کو سزا دینے کا پورا پورا حق رکھتی ہے اور اس حق کو، ظاہر ہے وہ اپنے سربراہ کے ذریعے ہی سے استعمال کرتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خاندان کی چھوٹی سی ریاست میں بھی نشوز و بغاوت کی حالت پیدا ہو جائے اور شوہر کو بحیثیت سربراہ تادیب کا یہ حق دے دیا جائے تو اس میں آخر ظلم کیا ہے؟

ثانیاً، عورت جب اپنے آپ کو ایک مسلمان مرد کے عقد میں دیتی ہے تو وہ یہ فیصلہ اس شعور کے ساتھ کرتی ہے کہ اس کے شوہر کو بصورت نشوز اس کو سزا دینے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ بعد از نکاح اس پر اعتراض کرنا یا کسی دوسرے کا اس پر چیں بجبیں ہونا، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ثالثاً، یہ مار بھی، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک ہلکی مار ہے اور اسی سزا کی مثل ہے جو استاد اپنے شاگرد کو اور ایک باپ اپنی اولاد کو دیا کرتا ہے، اس لیے اس پر اتنا متوحش ہو جانا کہ اس کو ظلم کی صورت قرار دے دینا، ویسے بھی بہت عجیب ہے۔

رابعاً، مرد کو دیا جانے والا یہ حق ضرب، بیان کردہ تدابیر میں ترتیب کے لحاظ سے آخری جگہ پر ہے، اس لیے بہت سی صورتوں میں تو اس مار کی نوبت ہی نہ آئے گی اور نصیحت کرنے اور خلا ملا کے ترک کر دینے ہی سے بگڑی ہوئی بات بن جائے گی۔ چنانچہ اسی سزا کی بات کو لے اڑنا، اس پر واویلا کرنا اور اسے ظلم کی داستان تک کہہ ڈالنا بہرحال ایک طرح کا تجاوز یا پھر تجاہل ہی ہے۔

خامساً، 'وَاضۡرِبُوۡهُنَّ' کی ہدایت سے اصل مقصود سزا دینا ہے ہی نہیں، بلکہ عورت کے نشوز کی اصلاح کرنا ہے۔ سو کسی عورت کے احوال اگر یہ بتا دیں کہ اس کی اصلاح اس کے پٹنے ہی پر موقوف ہے کہ ہر انسان ایک سی طبیعت رکھتا ہے اور نہ کسی بات کا اثر قبول کرنے میں ایک جیسے رویوں کا اظہار کرتا ہے، تو حصول مقصد کے لیے اس تدبیر پر عمل کر لینے میں آخر کون سی رکاوٹ ہے؟ بالخصوص اس وقت کہ جب بہت سے معاشرے آج بھی اس بات کے گواہ ہوں کہ وہاں یہ تدبیر بڑی حد تک کارگر رہتی اور مطلوبہ نتائج کو بحسن وخوبی فراہم کرتی ہے۔

سادساً، جو حضرات عورت کو سزا دینے پر اس لیے معترض ہیں کہ کئی عورتیں اس سے مزید بگڑ جاتی اور کئی معاشروں میں ریاستی قوانین کی وجہ سے اس پر عمل کرنا ہی ناممکن ہوتا ہے، تو ان اہل علم کے سامنے ایک بات ضرور واضح رہنی چاہیے، وہ یہ کہ زیر بحث آیات میں صرف مردوں کی قوامیت کا بیان، درحقیقت شریعت کا بیان ہے۔ اس کے بعد جو تدبیریں تجویز کی گئی ہیں، وہ بذات خود کوئی شرعی قانون نہیں، بلکہ اس پر عمل کرنے کا طریقہ، یعنی پروسیجرل لا

(Procedural Law) ہے۔ آسان لفظوں میں یہ کہ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، یہ بات شریعت ہے اور اس پر عمل کرنا انتہائی ضروری بھی ہے، مگر اس سربراہی کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنے اور خاندان کو بچانے کی سب تدبیریں، اپنی حقیقت میں شریعت نہیں ہیں، اس لیے ان کو اختیار کرنا یا حسب حال اختیار کرنا، سو فیصد ہماری صواب دید پر منحصر ہے۔ چنانچہ جو عورت مار کھا کر مزید خراب ہوتی ہو یا پھر جن معاشروں کا رواج اس مار کی اجازت نہ دیتا ہو، وہاں یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ سزا کی اس تدبیر پر عمل کیا جائے، بلکہ نشوز کی اصلاح کے جو طریقے عورت اور معاشرے کے مناسب حال معلوم ہوں اور شریعت کی روشنی میں صحیح قرار پاتے ہوں، وہاں انھی پر عمل کیا جانا چاہیے۔ مزید یہ کہ اس معاملے میں قانون سازی کرنے، حتیٰ کہ سزا کی یہ تدبیر شوہر کے ہاتھ سے لے کر عدالت کو دے دینے کی بھی اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو تو اصلاح احوال کے لیے یہ سب بھی کر لینا چاہیے۔

رشتۂ نکاح کو بچانے کی اجتماعی تدبیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شوہر اپنی عورتوں کو نصیحت کریں، انھیں بستروں پر تنہا چھوڑ دیں یا پھر ان کی تادیب کریں، ان تینوں صورتوں کے دوران میں جس وقت بھی وہ آمادۂ اصلاح ہو جائیں تو اب شوہروں کو حکم ہے کہ 'فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡھِنَّ سَبِیۡلًا'، یعنی عورتیں اگر تمھاری اطاعت کا رویہ اختیار کر لیں تو اب ان پر کسی الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ اس کے بعد 'اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا' کے الفاظ ہیں جن میں مردوں کے لیے بڑی پرزور تنبیہ بھی ہے اور ایک طرح کی ترغیب بھی۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں اگر نشوز کو ترک کر دیں تو مردوں کو ان کے سابقہ رویے کی بنا پر یا پھر اپنی سربراہی کے زعم میں ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے، وگرنہ وہ یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی محدود درجے کی اس سربراہی کی کیا حیثیت ہے، اللہ تو ان سمیت، سب سے بلند اور بہت بڑی ذات ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس درجہ عظمت کے باوجود اپنے بندوں کی سرکشی سے درگزر کرتا اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، اس لیے انھیں بھی چاہیے کہ وہ بھی عفو و درگذر کا رویہ ہی اختیار کریں۔

لیکن اگر صورت حال یہ ہو کہ زیر بحث یہ تینوں تدبیریں مسئلے کو نہ سلجھا سکیں اور عورت کا نشوز اسی طرح برقرار رہے تو اب شوہر کا یہ حق نہیں کہ وہ ان سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کرے اور نہ عورت ہی پر یہ لازم ہے کہ وہ اس کے ساتھ چمٹ کر رہ جائے۔ تاہم خاندان کا ادارہ چونکہ انسانی معاشرے کی اساس ہے اور خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ جب ایک مرتبہ اس کو قائم کر لیا جائے تو حتی الامکان اسے ختم کرنے سے گریز کیا جائے، اس لیے آخری کوشش کے طور پر

اب اس نے معاشرے کی اجتماعیت کو حکم دیا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر معاملات کو درست کریں، کیونکہ نزاعی صورتوں میں معاملہ کے براہ راست فریق بسا اوقات بے جا خودداری اور ناروا قسم کی ضد میں مبتلا ہو جاتے اور اپنی بات سے ذرا بھر پیچھے ہٹ جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسے وقت میں اگر دوسرے لوگ، جو بالخصوص ان کے ہمدرد بھی ہوں، شریک معاملہ ہو جائیں تو فریقین میں مصالحت ہو جانے کا ایک واضح امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: 'وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا'*، یعنی اگر تم لوگ میاں اور بیوی کے درمیان میں افتراق کا اندیشہ محسوس کرو تو ایک حَکَم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۔

رشتۂ نکاح کو بچانے کی اس آخری تدبیر میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ میاں اور بیوی، دونوں کے خاندان میں سے ایک ایک شخص کو مقرر کیا جائے۔ یہ اس لیے کہ خاندان کے لوگ ہی ان کے حقیقی ہمدرد اور خیر خواہ، ان کے گھریلو حالات سے صحیح طور پر واقف اور ان دونوں پر اپنے تعلق کی بنا پر ذاتی اثر ورسوخ رکھتے ہوں گے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اسی طرح کی چیزیں ہوتی ہیں جو مصالحتی عمل کو انگیز کر دیتی اور بالعموم، اسے نتیجہ خیز بنا دیا کرتی ہیں۔

ان اشخاص کے لیے قرآن مجید نے جو 'حَكَم' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے بعض حضرات کو ایک اشکال پیش آ گیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مصالحت کا یہ عمل شاید ایک عدالتی کارروائی ہے اور 'حکمین' کی حیثیت ہر طرح کا فیصلہ کر دینے والے ایک قاضی کی سی ہے، حتیٰ کہ وہ فریقین میں اگر علیحدگی کا فیصلہ بھی سنا دیں تو ایسا کرنے کا انھیں حق حاصل ہے، دراں حالیکہ صرف 'حَكَم' کے لفظ سے یہ ساری بات اخذ کر لینا، کسی بھی صورت صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس لفظ سے مراد محض فیصلہ کرنے والے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ فیصلہ عدالت میں ہو رہا ہے یا مصالحتی کمیٹی میں، یا پھر کسی پنچایت میں۔ یہاں اس سے مراد عدالت اور عدالتی فیصلہ کے بجائے پنچایت اور پنچایتی قسم کا فیصلہ ہی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اول تو حکمین چونکہ مرد وعورت کے خاندان میں سے ہوں گے، اس لیے ظاہر ہے کہ معاشرے کے ہر مرد وعورت کا خاندان نہ عدالت ہے اور نہ عدالتی اختیارات ہی رکھتا ہے۔ دوم یہ کہ 'وَاِنْ خِفْتُمْ' میں معاشرے کی اجتماعیت سے، جو منظّم ہو جائے تو باقاعدہ ریاست اور پھر عدالت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، خطاب کیا گیا ہے اور انھیں یہ ہدایت ہوئی ہے کہ وہ حَکَم مقرر کر دیں۔ چنانچہ جنھیں ریاست یا پھر عدالت مقرر کر رہی ہو، وہ بہر حال خود عدالت نہیں ہیں۔ تاہم یہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر عدالت ہی کسی کو حَکَم مقرر کر دے اور اسے اپنے اختیارات بھی سونپ دے تو ایسا ہو جانے میں آخر کیا مانع ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس اِمکان کو مان لینے میں کوئی مانع نہیں ہے، مگر ضروری ہے کہ زیر بحث آیات میں اس کی کوئی دلیل بھی پائی جاتی ہو، حالاں کہ یہاں اس کے

* النساء۴: ۳۵۔

برخلاف یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے پاس اس طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اور ان کی حیثیت صرف اور صرف مصالحت کے عمل کو نتیجہ خیز بنانے والے عاملین کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں 'اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا' کے الفاظ آئے ہیں جن کے ذریعے سے صلح کا ذکر تو کیا گیا ہے، مگر تفریق کا یہاں اشارہ تک نہیں ہے۔ اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے، اس لیے کہ علیحدگی کا فیصلہ اور اس کا حق شوہر یا بعض صورتوں میں عدالت کو تو حاصل ہے، ان کے سوا کسی اور کو اس بات کا حق بالکل بھی نہیں ہے۔

اس تدبیر کو بیان کر دینے کے بعد 'اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا' کے الفاظ میں فرمایا ہے کہ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ ان ''دونوں'' سے بعض لوگوں نے حکمین کو مراد لیا ہے اور بعض نے خود میاں اور بیوی کو، حالاں کہ حکمین کا اس معاملہ میں دخل دینا ہے ہی اصلاح کار کے لیے، اس لیے ان کو اس مقصد کے لیے مقرر کر دینے کے بعد پھر ان کے لیے یہ الفاظ لانا، موقع سے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے، البتہ ان کے تقرر کے بعد میاں اور بیوی کے بارے میں یہ الفاظ لانا، عین تقاضاے کلام ہے کہ معاملے کے اصل فریق یہی دونوں ہیں اور صلح کا واقع ہو جانا، اصل میں انھی کے ارادے اور نیتوں پر منحصر ہے۔ چنانچہ 'اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا' کے الفاظ میں میاں اور بیوی کو ابھارا ہے کہ اصلاح احوال کے اس آخری موقع کو وہ اپنے لیے غنیمت جانیں اور آپس کے اختلافات کو بھلا کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد 'یُوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا' میں فرمایا ہے کہ اگر وہ افتراق سے بچنے کے لیے اصلاح کا نیک ارادہ کر لیں گے تو اللہ کی عنایت خاص بھی ان کے شامل حال ہو جائے گی اور اس وقت جو اختلاف رونما ہو گیا ہے، وہ بتوفیق ایزدی پھر سے موافقت میں بدل جائے گا۔

آخر میں 'اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا' کے الفاظ ہیں جو ہر ذات، ہر بات، حتیٰ کہ ہر خیال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علیم اور خبیر ہونے کا بیان کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ اصلاح کے عمل میں شریک ہونے والے ہر شخص پر بڑا زبردست قسم کا پہرا بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہ سب اس شعور اور اس سوچ کے ساتھ اس نیک کام کو انجام دیں کہ ان کی کوئی حرکت اور کوئی نیت، اُس علیم و خبیر خدا سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مولانا الطاف حسین حالی

فضول خرچی کا انجام

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گداے ظریف — جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم بیش — سخی ہو اس میں کہ ممسک[1] غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند — کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اس کا — درم ایک اس نے بھی چاہا کہ کیجیے نذر فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت — کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر[2]
پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار[3] — کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللّلے تللّے[4] رہے تو آپ کو بھی! — ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے — دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

---

۱ بھول، کنجوس۔

۲ جو کے برابر۔

۳ اشرفی۔

۴ طور طریقے، رنگ ڈھنگ۔